© rasailojaraid.com

ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری)

اسلامی قانون کے ارتقاء میں اجتہاد کا کردار

مصر کے معروف عالم مرحوم ڈاکٹر احمد امین نے مسلم دُنیا کے فکری انحطاط پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''تقریباً پانچ سو سال سے مسلمانوں نے فکری میدان میں جو کچھ لکھا ہے، اگر اسے غرقِ دریا کر دیا جائے، تو اس سے علم و ادب کو کوئی زیادہ نقصان اُٹھانا نہیں پڑے گا۔''[۱] ہر چند ڈاکٹر موصوف کی تنقید میں قدرے شدت پائی جاتی ہے، لیکن اُنھوں نے مسلمانوں کے فکری زوال کو بیان کرنے اور انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے وہی کچھ کہا ہے جو ان سے پہلے دورِ حاضر کے مسلم مفکرین کہہ چکے تھے۔ مسلم مفکرین نے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، شیخ جمال الدین افغانیؒ نے کہا تھا: ''یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا، چہ معنی دارد؟ (قرآن و سنت) کی کس نص سے یہ دروازہ بند کیا گیا ہے، اور کس امام نے یہ کہا ہے کہ میرے بعد مسلمانوں کو دین میں بصیرت و ادراک حاصل کرنا مناسب نہیں ہے یا انھیں قرآنِ مجید اور حدیثِ صحیح سے ہدایت حاصل کرنی نہیں چاہیے، یا اُن کے مفہوم و مراد کی گہرائی میں اُترنے اور اسے وسعت دینے کے لیے سعی و نشاط سے کام لینا نہیں چاہیے۔''[۲]

بے شبہ مسلم تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ مسلمان اپنے دورِ انحطاط میں اسی مرض میں مبتلا ہوئے جس میں ان سے قبل بعض دوسری مذہبی جماعتیں مبتلا ہو چکی تھیں۔ لیکن دوسری جماعتوں کا فکری جمود و تعطل میں مبتلا ہونا چنداں حیرت انگیز نہیں کیوں کہ بہ قول رسل Russell ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی صحیفوں میں ہمیں ایک لفظ بھی ذہانت کی تعریف میں نہیں ملتا، رسل کا کہنا ہے کہ:

"So far as I can remember there is not one word in the Gospels in praise of intelligence."

لیکن قرآن مجید نے تو بار بار انسانی فکر و عقل سے خطاب کرتے ہوئے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو کائنات کے حقائق و دقائق کا مشاہدہ کرنے سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں، جو قدم قدم پر تاریخ کے نشانات پر غور وفکر کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ قرآن نے ایسے لوگوں کی عقل و دانش اور ہوش و حواس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اُن کے پاس عقل ہے، لیکن سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، اُن کے پاس کان ہیں، لیکن سنتے نہیں۔ یہ لوگ گمراہی میں حیوانات سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ (الاعراف:۱۷۹)

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ قرآن مجید، اسلامی فکر کا بنیادی ماخذ ہے اور انسانی سعادت و ہدایت کا سرچشمہ۔ چنانچہ جب قرآن مجید اور رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و تربیت نے صحابۂ کرامؓ کی فکری صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ان کی بے کیف زندگیوں میں معنویت پیدا کی، تو اُنھوں نے روحانی طور پر ایک نیا جنم لیا۔ اب قرآن ان کی فکر و نظر کا مرکز تھا، اس کی تعلیمات اور اس کے اسرار و حکم اُن کی سوچ بچار کا محور۔ اُنھوں نے قرآن مجید کے فلسفہ وحکمت کو سمجھنے کے لیے مقدور بھر محنت سے کام لیا، یہی فکری ریاضت ہے، جسے ہم آج اجتہاد سے یاد کرتے ہیں۔[۳] چوں کہ صحابۂ کرامؓ اپنی ذہنی صلاحیتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، اس لیے قرآن فہمی اور اس کے حقائق و معانی کے ادراک میں بھی وہ یکساں مقام نہیں رکھتے تھے۔ اگر انھیں قرآن کے کسی مقام پر کوئی مشکل پیش آتی، تو وہ آنحضرتؐ سے رجوع کرتے، اور آنحضرتؐ بعض اوقات کسی مسئلے کو کسی بزرگ کے حوالے کر دیتے، جو آپ کی موجودگی میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے، اس سے مقصد صحابۂ کرامؓ کی فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنا تھا۔ چنانچہ صحابۂ کرامؓ نہ صرف قرآنِ مجید کے معانی پر غور وفکر کرتے، بلکہ رسول اللہؐ کے فرمودات پر بھی سوچ بچار کرتے، وہ الفاظ کے ظاہری معانی کے ادراک ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلسلے میں علماء نے متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسولِ کریمؐ نے یومِ احزاب کے موقع پر فرمایا کہ نمازِ عصر بنی قریظہ پہنچ کر ادا کی جائے گی، لیکن ہوا یہ کہ راہ ہی میں وقتِ نماز آ گیا۔ جس پر بعض صحابہؓ نے کہا کہ ہم تو منزل پر پہنچ کر ہی نماز پڑھیں گے، لیکن دوسرے بزرگوں نے فرمایا کہ نہیں! ہم تو ابھی نماز پڑھیں گے۔ رہا رسولِ کریمؐ کا یہ فرمان کہ منزل پر پہنچ کر ہی نماز پڑھی جائے تو اس فرمان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں جلدی اور تیزی سے کام لینا چاہیے، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ راہ میں نماز ہی نہ پڑھی جائے۔ القصہ جب آنحضرتؐ کے سامنے اس واقعہ کا ذکر آیا تو آپ نے کسی فریق کو ہدفِ ملام نہیں بنایا۔ یعنی جن بزرگوں نے سوچ بچار سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آنحضرتؐ کے فرمان کا مطلب منزل تک جلد پہنچنا تھا، نماز پڑھنے سے روکنا نہیں تھا۔ آنحضرتؐ نے اُن سے یہ نہیں فرمایا کہ آخر تم لوگوں نے حدیث کے ظاہری مفہوم و مراد پر عمل کیوں نہیں کیا۔[۴] اِسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ آنحضرتؐ ہی کے سامنے پیش آیا، جب قبیلۂ بنی نضیر سے جنگ کا واقعہ پیش آیا تو مسلم فوج نے خالص جنگی نقطۂ نظر سے بعض درختوں کو کاٹ دیا جو محاصرہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ یہ اَمر یعنی درختوں کا کاٹنا بہ ظاہر قرآن کی اس آیت کے خلاف تھا، جس میں فساد فی الارض کی مذمت کی گئی ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے:

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْل.

(البقرۃ:۲۰۵)

یعنی جب یہ مفسد برسرِ اقتدار آتے ہیں تو فصلوں اور نسلوں تک کو برباد کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں مسلم فوج شام کی طرف بڑھی تو خلیفۂ راشد نے ان سے فرمایا: ''دیکھنا! پھل دار درختوں اور فصلوں کو نہ کاٹنا، نیز انسانی بستیوں کو ویران نہ کرنا۔'' چنانچہ جب جنگی مصلحت کے پیشِ نظر بنی نضیر کے درختوں کو کاٹا گیا تو اُنھوں نے شور مچایا کہ محمدؐ ایک طرف تو فساد فی الارض سے روکتے ہیں، لیکن دوسری طرف خود اُن کے ساتھی درختوں کو کاٹ رہے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ کے اس اجتہادی قدم کو کہ جنگی ضرورت کے پیشِ نظر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درختوں کو کاٹنا ناگزیر تھا، قرآن مجید نے 'سورۃ الحشر' میں جائز قرار دیا اور اسے فساد فی الارض سے تعبیر نہیں کیا۔ اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ قرآنِ مجید کی کسی نص کے عمومی حکم کو کسی دوسری مصلحت کے پیشِ نظر (جس کا ادراک انسانی عقل نے مقدور بھر سوچ بچار کے بعد کیا ہے اور قرآن وسنت کے فلسفہ وحکمت کی روشنی میں کیا ہے) محدود کیا جا سکتا ہے۔

آثار واحادیث میں ایسے کئی واقعات کا تذکرہ آیا ہے، جن میں کہا گیا ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ نے کسی قرآنی نص یا حدیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا تھا، تو آنحضرتؐ نے انھیں صحیح مفہوم سے آگاہ فرمایا۔ اس قسم کے واقعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رسولِ کریمؐ کی حیاتِ طیبہ میں جب ممتاز صحابۂ کرامؓ مثلاً حضرت عمرؓ یا حضرت علیؓ نے قرآن یا آنحضرتؐ کے فرمودات کی تشریح میں اجتہاد سے کام لیا، تو آنحضرتؐ نے اسے پسند فرمایا کیونکہ اُن کا اجتہاد روحِ شریعت یا روحِ عدل کے مطابق تھا اور شریعت کے بنیادی مقاصد کو پورا کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریمؐ نے ایسے اجتہاد پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ آپؐ نے ایک بار حضرت معاذ بن جبل سے جو یمن میں گورنر بن کر جا رہے تھے، فرمایا کہ اگر تم قرآن وسنت میں کسی قضیہ کا حل نہ پاؤ تو پھر کیا کرو گے؟ مَیں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔ (اجتهد برأيي) حضرت معاذؓ نے جواب میں عرض کیا۔ رسولِ کریمؐ نے اس جواب کو پسند فرمایا۔ حضرت معاذؓ نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنی جس رائے یا اجتہاد کا ذکر کیا تھا، حضرت عمرؓ نے اسی رائے کو اختیار کرنے کا مشورہ قاضی شریح کو دیا تھا۔ آپ نے قاضی صاحب موصوف کو لکھا تھا کہ اگر تمھیں فیصلہ کرتے وقت اللہ کی کتاب، رسول اللہؐ کے فیصلوں سے کوئی چیز نہ ملے تو پھر اپنی رائے سے (سوچ بچار کرتے ہوئے) کام لو اور اہلِ علم سے مشورہ کرو۔ (فاجتهد برأيك واستشر أهلَ العِلم والاصلاح)۔ اِسی قسم کا ایک واقعہ حضرت علیؓ سے مروی ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

''مَیں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! ہمیں بعض اوقات ایسے امور سے واسطہ پڑتا ہے، جن کے بارے میں نہ تو قرآنِ مجید میں کچھ نازل ہوا ہے اور نہ ہی آپ کی سنت نے کوئی فیصلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا ہے۔" اِس پر رسولِ کریمؐ نے فرمایا:

"ایسی صورت میں مؤمنین میں سے اہلِ علم کو اکٹھا کرو اور زیرِ بحث مسئلہ کو باہمی مشورہ سے طے کرو، اور کسی ایک رائے پر (بغیر مشورہ) فیصلہ نہ دو۔"

اِن واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا کہ رسولِ کریمؐ اور صحابہ کرامؓ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ زندگی تغیر پذیر واقع ہوئی ہے اور نیا دن، نیا وقت اپنے جلو میں نئے مسائل اور نئی مشکلات لاتا ہے، جن سے مسلمان باہمی غور وفکر اور صلاح ومشورہ ہی سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

رسولِ کریمؐ کی حیاتِ طیبہ میں صحابۂ کرامؓ کے اجتہاد اور رائے کا دائرہ وسیع نہیں تھا۔ انھیں جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو وہ آنحضرتؐ سے پوچھتے، آپ یا تو انھیں قرآنِ مجید کے احکام سے آگاہ فرماتے، یا اپنی طرف سے کوئی فیصلہ فرمادیتے، یہ فیصلہ قرآن مجید ہی کے احکام کی تشریح وتفسیر شمار کیا جاتا، مثلاً شریعت نے ماں بیٹی، یا دو بہنوں سے ایک ہی وقت میں شادی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ رسولِ کریمؐ نے اس حکم میں مزید اضافہ فرمایا کہ پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی سے بھی ایک ہی وقت میں عقد نہیں کیا جاسکتا۔ آپؐ کے وصال کے بعد اجتہاد کا دائرہ وسیع ہوا۔ اب جدید مسائل کے حل کے لیے آپؐ کی ذاتِ گرامیؐ صحابۂ کرامؓ کے درمیان موجود نہ تھی۔ جس کی وجہ سے فلسفۂ قرآن وسنت کی روشنی میں انسانی عقل وبصیرت کو کام کرنے کے لیے زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ جس سے اجتہاد کو ایک بلند مقام ملا، اور اسے اسلامی تشریع میں تیسرا بنیادی ماخذ شمار کرلیا گیا، لیکن یہ اجتہاد جسے رسولِ کریمؐ اور صحابۂ کرامؓ نے 'رائے' بھی کہا ہے۔ عموماً اجتماعی مشورے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا تھا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں، خاص طور پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں اگر صحابۂ کرامؓ زیرِ بحث قضیہ پر آزادانہ غور و فکر کے بعد کسی ایک رائے پر اتفاق کر لیتے، تو اس رائے پر عمل کرنا اُمّت کے لیے لازمی قرار دیا گیا اور اسی اجتماعی رائے کو اجماع سے بھی تعبیر کیا گیا۔ اس اجتماعی رائے کی صحت پر علماء نے سورۃ النساء کی اس آیت سے استدلال کیا ہے، جس میں ارشادِ باریٰ تعالیٰ ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"وَمَنْ يَشاقق الرَّسُولَ مِنْ بعد ما تَبيّن لَه الهدى وَيَتّبع غيرَ سَبِيل المؤمِنينَ نَوّله مَا تولى." (النساء:۱۱۵)

یعنی جو آدمی رسول کریمؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہے اور اہلِ ایمان کی راہ کے سوا کسی اور راہ پر چلتا ہے، حالانکہ اس پر راہِ ہدایت کھل چکی ہے تو ہم اسے اسی راہ پر چلائیں گے جس پر وہ خود چلے گا۔" اِسی معنی میں آنحضرتؐ سے ایک روایت بھی آئی ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ میری اُمت غلطی پر یک جا نہیں ہوگی۔

یہاں یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ اجتہاد کا یہ شرف صرف انہی بزرگوںؒ کے حصہ میں آیا جنھیں خدا نے حکمت و دانش سے نوازا تھا اور قرآن فہمی کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ صحابہؓ کرامؓ نے نہ صرف سیاست اور معیشت کے مسائل میں اجتہاد فرمایا اور نئے نئے تجربے کیے، بلکہ ان مسائل میں بھی اجتہاد فرمایا جن میں قرآن و سنت اپنا فیصلہ دے چکے تھے۔ لیکن جدید وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر صحابہؓ نے نصوص کی تشریح و تاویل میں حق و صداقت کی نئی نئی جہتوں کو دریافت کیا۔ صحابۂ کرامؓ نے جو اجتہادات فرمائے اہلِ علم نے ان کے تین درجات مقرر کیے ہیں:

۱۔ ان اجتہادات کا تعلق قرآن وسنت کی تعبیر و تفسیر سے تھا۔

۲۔ کسی زیرِ بحث مسئلے کو کتاب وسنت میں اس سے ملتے جلتے مسائل، یعنی امثال و اشباہ پر قیاس کرنا۔

۳۔ اجتہاد کا کسی خاص معین نص پر اعتماد کرنے کے بجائے روحِ شریعت پر اعتماد کرنا، علما نے کہا ہے کہ شریعتِ مقدسہ کا منتہائے نظر مخلوق کی بھلائی اور عدل و انصاف کا قیام ہے، جس جگہ یہ بھلائی پائی جائے گی، وہی شریعت ہوگی۔ [۵] اجتہاد میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھی گئی کہ

"جس چیز کو مسلمان جماعتی طور پر بہتر جانتے ہیں، وہ عنداللہ بھی حسن اور بہتر ہے۔"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں چند ایسے احکام بھی جاری کیے، جو بہ ظاہر قرآن کے صریح حکم سے متصادم نظر آتے ہیں، یا آپ نے بعض احکام کو موقوف کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا، جن پر عہدِ رسالت میں عمل ہوتا تھا۔ مثلاً جب عراق، اِسلامی ریاست کا حصہ بنا، تو آپ نے عراق کی زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ریاست کی ملکیت قرار دیا۔ مفتوحہ اراضی کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمرؓ نے کئی روز تک صحابۂ کرامؓ سے بات چیت کی۔ اس مسئلہ پر دو رائیں تھیں۔ بعض بزرگوں کا کہنا تھا کہ ان زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے، جیسا کہ خود رسولِ کریمؐ نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ دوسری رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کو ریاست کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ حضرت معاذؓ نے جو اس رائے کے حق میں تھے، یہاں تک کہا:

''اگر آپ نے (حضرت عمرؓ) ان زمینوں کو تقسیم کر دیا (اور ریاست کی تحویل میں نہ دیا) تو یہ (فوجی) لوگ بہت بڑے سرمایہ کے مالک بن جائیں گے، ان کے مرنے کے بعد یہ ساری جائداد کسی ایک آدمی یا عورت کی طرف منتقل ہو کر رہ جائے گی۔'' حضرت معاذؓ کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر معروف دوالبی نے لکھا ہے کہ حضرت معاذؓ نے اپنی تقریر میں اسی چیز کی (اکتنازِ دولت) مذمت کی ہے، جس کی برائی آج کے سوشلسٹ کر رہے ہیں، یعنی اللہ کی وسیع سرزمین بالآخر ایک شخص کی ملکیت میں آ جائے گی، جس پر کاشت کاروں کی ایک بڑی جماعت کام کرے گی، جن کی محنت پر ایک آدمی دادِ عیش دے گا۔''[۶] القصہ عراقی زمینوں کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے موقف کی حمایت میں 'سورۃ الحشر' کی آخری آیات سے استدلال کیا۔ جن میں کہا گیا ہے کہ ''سرمایہ صرف مالدار آدمیوں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔'' بالآخر مہاجرین اور انصار کے اربابِ حل وعقد نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ ان اراضی کو ریاست کی تحویل میں دے دیا جائے۔[۷]

انھی اجتہادات میں سے ایک اجتہاد یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے عرب سوسائٹی سے غلامی کی رسم کو ختم کرنے کے لیے قانونی قدم اُٹھایا، اور فرمایا کہ آئندہ کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جا سکے گا، یا جو باندی صاحبِ اولاد ہوگئی ہے اس کی خرید وفروخت ممنوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اجتہادات میں حضرت عمرؓ نے قرآنِ مجید کی کسی نص کو معطل یا موقوف نہیں کیا، بلکہ بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر قرآنی نصوص کی جدید تعبیر کی، جو شریعت کے مزاج اور فلسفہ وحکمت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابقت رکھتی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جدید حالات کے پیشِ نظر اپنے ہی ایک فیصلہ کو دوسرے وقت میں بدل دیا تھا، مثلاً آپ نے میراث کے قضیہ میں حقیقی اولاد کو میراث سے محروم رکھنے کا فیصلہ دیا۔ لیکن جب یہی مسئلہ ایک عرصہ کے بعد دوبارہ ان کے سامنے آیا تو اُنھوں نے حقیقی اولاد اور ماں میں شریک اولاد دونوں کو میراث میں حصہ دینے کا فیصلہ صادر فرمایا، جب آپ سے آپ کے پہلے فیصلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''پہلا فیصلہ وہی تھا جو ہم نے (اپنے اجتہاد کے مطابق، اس وقت) صادر کیا تھا، اور یہ فیصلہ جو ہم اب دے رہے ہیں (اس اجتہاد کے مطابق ہے)۔'' **ذٰلِکَ مَا قَضینا، وَهٰذا عَلی مَا نَقضی**''۔

یہاں پر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ حضرت عمرؓ نے نہ صرف اپنے ایک فیصلے کو دوسرے اجتہادی فیصلے سے بدلا، بلکہ اپنے عہدِ خلافت میں بعض ان فیصلوں کو بھی بدل دیا، جو خلیفۂ اوّلؓ نے اپنے زمانہ میں دیے تھے۔ حضرت عمرؓ کے ان فیصلوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا:-

۱۔ ایک مجتہد اپنی ایک اجتہادی رائے کو دوسری رائے سے بدل سکتا ہے۔

۲۔ ایک مجتہد حاکم اپنے سے پیشرو حاکم کے فیصلوں کا پابند نہیں۔

۳۔ ہر نسل کو اپنے مسائل خود ہی حل کرنے چاہئیں، اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے اسے اپنے سے پہلی نسل کے فیصلوں کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے جنھیں خدا نے مجتہدانہ بصیرت عطا فرمائی تھی، کہا ہے: ''عہدِ حاضر میں مسلم دُنیا کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ مغرب میں جو انقلاب رونما ہوا ہے، اِس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر پورے اعتماد (ضبطِ نفس) اور گہری بصیرت کے ساتھ اسلام کے بنیادی مقاصد Ultimate Aims کو بہ حیثیت ایک اجتماعی سیاست (Social Polity) پیش کریں۔'' علامہ نے مزید فرمایا: ''قرآن مجید کی تعلیم کہ زندگی ایک ترقی یافتہ تخلیقی عمل ہے، یہ ضروری قرار دیتی ہے کہ ہر نسل کو جو اپنے اسلاف کے (تخلیقی) کام سے روشنی حاصل کرتی ہے، یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے مسائل کو خود ہی سلجھائے۔''[۸] اقبال نے اس مسئلے پر لکھتے ہوئے مزید کہا کہ: ''ہماری راہ میں جو مشکلات حائل ہیں، مجھے ان کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احساس ہے۔ لیکن مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم نے اپنی مشکلات پر قابو نہ پایا تو زمانہ ہم سے بہت جلد اپنی جان چھڑا لے گا۔"[۹] واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت: "مَآ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيكم فی الدِّين من حَرجٍ." (۲۲:۷۸) یعنی اللہ نے دین کے بارے میں تم پر سختی نہیں کی اور رسولِ کریمؐ کی حدیث شریف "لَا ضَرر وَلا ضَرار"۔ (نہ نقصان دو، نہ خود نقصان اُٹھاؤ) کو صحابۂ کرامؓ کے اجتہادات کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اہلِ علم نے قانون سازی کے سلسلہ میں مزید کہا ہے کہ "وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ احکام بھی بدل جاتے ہیں۔" (تتغيّر الاحكام بتغيّر الازمان)، اِس اصول کو تسلیم کرنا بے شبہ ایک عظیم الشان اجتہادی عمل ہے، جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اہلِ بصیرت ہی لگا سکتے ہیں۔ علامہ ابنِ قیمؒ نے اپنی معروف تالیف 'اعلام الموقعین' میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔

ہر چند خلافتِ راشدہ کے دَور میں صحابۂ کرامؓ میں سیاسی اختلافات بھی نمودار ہوئے، جن کا رونما ہونا تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں، لیکن اجتہاد برابر کام کرتا رہا، اور ہر صاحبِ اجتہاد مقدور بھر غور و فکر کی صلاحیتوں سے کام لیتا اور مسائل کا حل تلاش کرتا، ہر آدمی بڑی آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا اور یہ اختلافِ رائے باہمی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ اُن کے ہاں اجتہاد کا مقصد تلاشِ حق تھا۔ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حق پرستی اور راست بازی کی گہری چھاپ تھی۔ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام اپنے ایک تاریخی خط میں قاضی کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: "اگر آج تم نے کوئی فیصلہ کیا ہے اور پھر تمہاری فکر (رائے) نے اس میں حق کا سراغ لگا لیا، تو یہ (پہلا) فیصلہ قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بننا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ حق قدیم ہے، کوئی چیز اس کو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتی، حق کی طرف واپس آنا باطل پر برابر ڈٹے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔" اِس خط کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں: "تمہارے اجتہادات کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ان میں کون سی رائے حق سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کے ہاں پسند۔"[۱۰] اسی قسم کا ایک تاریخی خط حضرت علیؓ نے مالک بن اشتر کے نام لکھا تھا۔ چونکہ ان اجتہادات کا مقصد سچائی اور اخلاقی قدروں کی بنیادوں پر ایسے معاشرہ کی تخلیق تھا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس میں عدل وانصاف اور بلند قدروں کی رُوح جاری وساری ہو، ایسے معاشرے کی تخلیق کے لیے خلافتِ راشدہ میں مسلسل تجربے کیے گئے، خاص طور پر حضرت عمرؓ کے عہد میں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ان تجربوں سے خوش نہیں تھے۔ اُنہوں نے اپنے آخری دَور میں فرمایا: ''آج مجھے جن باتوں کا پتا چلا ہے، اگر ان کا پتا پہلے چل گیا ہوتا تو مَیں مالدار لوگوں کی زائد دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔''[۱۱] اس ارشاد سے پتا چلتا ہے کہ وہ جس مثالی معاشرے کی تخلیق کے لیے انقلابی جدوجہد کر رہے تھے، اس سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور معاشرتی برائیوں کو روکنے کے لیے برابر انقلابی اقدامات اٹھاتے رہے۔ ان کے یہ تاریخی فیصلے اجتہاد کے رہینِ منت ہیں، جس سے انکار کرنا مشکل ہے۔

جب خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوا، اور بنو امیہ نے اقتدار پر قبضہ کیا تو اجتہاد کا دائرہ سکڑتا گیا۔ اب سیاست کا اعتماد تلوار پر تھا۔ شوریٰ یا اجتہاد پر نہیں تھا۔ خلافتِ راشدہ میں اجتہاد، اسلام کی بلند قدروں کو--- مساوات، آزادیٔ رائے، شوریٰ--- محسوس اور مؤثر ادارے کی شکل میں منتقل کرنے کے لیے کام کر رہا تھا۔ نئے دور کے حکمرانوں نے خلافتِ راشدہ کے اس تاریخی تجربے کے عمل کو روک دیا۔ اس دَور میں بڑے بڑے خدا ترس لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے علم وادب میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ لیکن اس دَور میں اہلِ علم میں فکری اختلاف بھی اُبھر کر سامنے آ گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ سنت کی تدوین وترتیب سے پہلے دُنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اور مسلم ریاست کی سرحدیں وسیع ہو چکی تھیں۔ جس کی وجہ سے وقت نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیے تھے، جن کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی ذکر نہ تھا۔ چنانچہ علماء کو اپنے اجتہاد اور رائے پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کرنا پڑا۔ خاص طور پر اہلِ عراق کو جو مدینہ منورہ سے دُور ہونے کی وجہ سے علم حدیث پر وہ عبور ورسوخ نہیں رکھتے تھے۔ جو اہلِ مدینہ کا امتیازی وصف تھا۔ چنانچہ اہلِ علم میں دو گروہ: اہلِ حدیث اور اہلِ رائے کے نام سے سامنے آئے۔ اہلِ عراق، اہل الرائے کے نام سے پکارے گئے۔ شیخ محمد الخضری مرحوم نے اپنی کتاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''تاریخ التشریع الاسلامی'' میں تفصیل سے ان دونوں پر بحث کی ہے۔ ان دونوں علمی جماعتوں میں فکری اختلاف اس حد تک بڑھے کہ اہل الرای میں سے بعض لوگوں نے شدت اور انتہاپسندی سے کام لیتے ہوئے سنت کا اس حیثیت سے انکار کیا کہ وہ بھی شریعت کا ایک ماخذ ہے۔ دوسری طرف اہلِ حدیث میں بعض بزرگوں نے رائے کی مذمت کی اور اس کی دوسری شکلوں: قیاس، استحسان وغیرہ کا انکار کیا۔ جس طرح اہلِ حدیث جماعت میں ضعیف اور بے بنیاد احادیث کو فروغ حاصل ہوا، جس سے خود ثقہ محدثین کرام کو ایک بڑی آزمائش سے واسطہ پڑا۔ انھیں بڑی دیدہ ریزی سے موضوع احادیث کی نشاندہی کرنا پڑی، اسی طرح اہلِ رائے گروہ میں اجتہاد اور رائے کے پردے میں ہوا و ہوس کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، جس پر خود سنجیدہ اہلِ رائے کو اجتہاد اور رائے کے بارے میں سوچنا پڑا، کہ شریعتِ مقدسہ میں کس قسم کے اجتہاد کی اجازت ہے اور کون اس کا اہل ہے؟ چوں کہ صحابۂ کرامؓ کے عہد میں اجتہاد کا بنیادی مقصد ادراکِ حقیقت کے لیے غور وفکر سے کام لینا اور پھر اس کی روشنی میں نئے مسائل کو حل کرنا تھا۔ اس لیے وہ بعض اوقات اپنے اجتہادات کے لیے کسی خاص معین نص کی تلاش نہیں کرتے تھے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے ایک بزرگ ضحاک بن قیس نے آ کر شکایت کی کہ وہ اپنی زمین کی سیرابی کے لیے ایک نہر کا بندوبست کر رہے ہیں، لیکن یہ نہر محمد بن مسلمہ نامی ساتھی کی زمین سے گزر کر ہی ان کی زمین تک پہنچ سکتی ہے، لیکن محمد بن مسلمہ مجھے (ضحاک) اپنی زمین سے اس نہر کو گزرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہر چند میں نے محمد کو سمجھایا کہ اس نہر سے ان کی زمین بھی سیراب ہوگی، لیکن اُنھوں نے میری بات نہیں سنی۔ حضرت عمرؓ نے ضحاک کی شکایت پر محمد کو بلایا اور ان سے کہا کہ جس چیز سے تمھیں کوئی نقصان نہیں، پھر تم اپنے بھائی (ضحاک) کو اس کے فائدے سے کیوں روکتے ہو۔ لیکن محمد نے حضرت عمرؓ کی بات بھی ماننے سے انکار کر دیا، جس پر حضرت عمرؓ نے ان سے کہا: ''بہ خدا! یہ نہر یقیناً ضحاک کے کھیت تک جائے گی۔'' چنانچہ آپ کے حکم سے یہ نہر ضحاک کے کھیت تک پہنچائی گئی۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی بنیاد ''مفادِ عامہ'' کا اصول تھا۔ اُنھوں نے اپنے فیصلے کے لیے کسی خاص نص کا سہارا نہیں لیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن نئے عہد میں جب اجتہاد ورائے میں ذاتی اَنا، اور ہوا وہوس کو مداخلت کا موقع ملا، تو اہلِ علم نے یہ طے کیا کہ ایک مجتہد کی رائے کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جائے گا، جب تک اس کی بنیاد کتاب، سنت اور اجماع پر نہ ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ رائے، رائے شمار نہیں ہوگی، چنانچہ اس رائے کو جس کا اعتماد کسی شرعی بنیاد پر ہے۔ قیاس کا نام دیا گیا، اس قیاس کی فہرست میں استحسان، استصلاح اور مصالح مرسلہ (مفادِ عامہ) جیسی فقہی اصطلاحات کو بھی داخل کیا جا سکتا ہے۔

رسولِ کریمؐ اور صحابہٴ کرامؓ کے عہد کے بعد تابعین کے تیسرے دَور میں بھی قرآن و سنت کی تشریح وتفسیر میں اجتہاد برابر کام کرتا رہا۔ مختلف سیاسی جماعتوں نے اپنے سیاسی افکار کی حمایت کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔ جس کی وجہ سے فکری اور فقہی بحثوں میں اجتہاد کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں مثلاً شیعہ، خوارج، معتزلہ، مرجۂ، جبریہ، متکلمین، اہلِ سنت کے افکار اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اموی دَور میں بھی فکری آزادی کس وسیع پیانے پر کام کر رہی تھی۔ دوسری صدی ہجری میں فقہ اور حدیث میں جو نامور علماء پیدا ہوئے ان میں حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام ابن حنبل کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور اُن کے نام سے مختلف فقہی مدارس وجود میں آئے، جو آج تک پوری مسلم دُنیا میں مقبول ومعروف ہیں۔ ان کے علاوہ امام جعفر صادق اور امام زید بھی جن کا نام تمام مسلمانوں میں انتہائی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے، مستقل فقہی مدارس کے بانی اور ائمہ قرار دیے گئے۔

ہر چند ائمہ اربعہ میں امام ابوحنیفہ کو اصحابِ رائے کا امام شمار کیا جاتا ہے، اور امام مالک کو اہلِ حدیث کا رہنما، لیکن امام مالک نے قیاس اور مصالح مرسلہ کے نام سے نئے مسائل کو حل کیا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض علماء نے انھیں (مثلاً ابنِ قتیبہ نے المعارف میں) علمائے رائے میں شمار کیا ہے۔ مثلاً امام مالک قیاس کے مقابلہ میں خبر احاد پر اعتماد نہیں کرتے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جس برتن میں کتا منہ ڈال دے، اسے کئی بار دھویا جائے، جب امام مالک کے سامنے اس روایت کا ذکر آیا تو اُنھوں نے کہا کہ کتے کا شکار تو جائز ہے، آخر اس کا لعاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکروہ کیوں ہے؟ یا امام مالک مصلحت نامی اُصول کے تحت چوری کے الزام میں ماخوذ ملزم کو جسمانی سزا دینے کے حق میں ہیں، لیکن دوسرے علماء نے ان سے اختلاف کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ ملزم بے گناہ ہو۔ ان ائمہ کے فقہی افکار میں جو بھی اختلاف ہو، لیکن یہ بزرگ اپنی نیکی، تقویٰ اور حق پرستی کی وجہ سے ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اور شدت سے آزادیٔ رائے کے قائل تھے۔ عباسی حکمران منصور اور ہارون الرشید نے امام مالک سے درخواست کی کہ وہ اُن کی معروف کتاب ''المؤطا'' کو سرکاری سطح پر قانون کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں، لیکن امام عالی مقام نے ان سے اتفاق نہیں کیا اور فرمایا کہ ہر شہر میں آنحضرتؐ کے صحابی اور اُن کے پیرو علماء موجود ہیں، جن پر لوگ اعتماد کرتے ہیں، ان سب کو کسی ایک رائے کا پابند بنانا درست نہیں ہے۔ تاریخِ اجتہاد کا یہ واقعہ بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ جن بزرگوں نے امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے مسلک کو مرتب کیا اور اسے مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے پوری تندہی سے کام کیا، وہ خود اکثر مسائل میں اپنے امام سے اختلاف رکھتے تھے۔ حنفی فقہ کو مدون کرنے اور اسے پھیلانے میں امام ابوحنیفہ کے نامور شاگرد ابو یوسف اور محمد بن حسن نے جو کام کیا ہے، وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، لیکن یہ دونوں بزرگ، اکثر مقامات پر اپنے استاذِ محترم سے اختلاف رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے امام کے جن افکار و آراء کو قبول کیا ہے، انھیں دلیل و برہان کی میزان پر تولنے کے بعد قبول کیا ہے۔ محض خوش اعتقادی، یا تقلید کی بناء پر قبول نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ اجتہاد کا مقصد تلاشِ حق ہے اور سچائی کی پیروی، چنانچہ جب ابو یوسف، امام مالک سے ملے اور احادیث کا علم ہوا تو اُنھوں نے اپنی بعض آراء سے رجوع کرتے ہوئے امام مالک سے کہا: 'ابوعبداللہ! مَیں آپ کی بات کو قبول کرتا ہوں، اگر میرے ساتھی (امام ابوحنیفہ) کو ان باتوں کا علم ہو جاتا، جن کا مجھے (اب) ہوا ہے۔ تو وہ بھی میری طرح (اپنی آراء) سے رجوع کر لیتے۔' یہی حق کی پیروی ہے، جس کا مشورہ حضرت عمرؓ نے اپنے تاریخی خط میں ابوموسیٰ اشعری کو دیا تھا کہ ''حق کی طرف واپسی باطل پر ڈٹے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔'' امام ابوحنیفہ فرمایا کرتے تھے کہ 'هذا رأيي وهذا أحسنُ مَا رَأيتُ فمَن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جَاءَ برأيٍ خَيرٍ منه قَبِلنَاه'' ''یہ میری رائے ہے، یہ میرے خیال میں سب سے بہتر رائے ہے، اگر کوئی اس سے بہتر رائے پیش کرے گا، تو ہم اسے قبول کریں گے۔'' اسی قسم کا ایک قول امام مالک سے روایت کیا جاتا ہے، وہ کہا کرتے تھے: أنما أنا بَشر، أُصيبُ وأخطى، فَأعرضوا قَولي عَلى الكتابِ وَالسُنّةِ. ''مَیں ایک آدمی ہوں اور غلطی بھی کرتا ہوں، صحیح بات بھی کہتا ہوں، میری رائے کو کتاب وسنت کے سامنے پیش کرو۔''

جس طرح ابو یوسف اور محمد بن حسن نے اکثر مسائل میں امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیا، اور ''کتاب الخراج'' میں ابو یوسف نے کھل کر اپنے امام کی رائے سے اختلاف کیا، اسی طرح امام مالک کے ساتھیوں نے ان کی فقہ کو مرتب کیا، لیکن ان کے افکار سے اختلاف بھی کیا۔ اشہب، ابن قاسم اور سحنون، مالکی فقہ کے بلند پایہ فقہاء شمار کیے جاتے ہیں، لیکن اُنھوں نے آنکھیں بند کر کے امام مالک کے افکار کو قبول نہیں کیا۔ ابن رشد نے لکھا ہے کہ اشہب اور ابن قاسم اپنی بحثوں میں امام مالک کی (علمی) غلطیوں کی نشاندہی کیا کرتے تھے، جسے بعض علماء پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ اجتہاد و رائے ہی کا کرشمہ تھا کہ آج ہمارے ہاتھوں میں فقہ اسلامی کا قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے، لیکن جب یہ فقہی آراء و افکار مرتب و مدون ہو گئے اور حسنِ اتفاق سے بعض فقہی مسالک کو حکومتِ وقت کی تائید بھی حاصل ہوگئی تو پھر مرورِ وقت کے بعد ان کے ماننے والوں میں اجتہادی رُدح کمزور ہوتی چلی گئی، اور اُنھوں نے ائمہ کرام کے افکار کو شریعتِ مقدسہ کا درجہ دے دیا۔ ہر مسلک کے پیروؤں نے شعوری یا لاشعوری طور پر دوسرے مسلک کو شکست دینے کی کوشش کی تاکہ حکومت کے سرکاری مناصب پر قبضہ رہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں یہ اختلافات اس حد تک بڑھے کہ دمشق کے قاضی محمد بن موسیٰ حنفی نے کہا: ''اگر میرے بس میں ہو تو مَیں شوافع پر جزیہ لگا دوں۔'' اسی طرح کی ایک روایت ابوحامد الطّوسی کی طرف منسوب ہے، اُنھوں نے کہا: لو كان لى أمرٌ فَوضعتُ على الحنابله الجزية. یعنی ''اگر مجھے اختیار ہوتا تو مَیں حنابلہ پر جزیہ عائد کر دیتا۔''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب فکر ونظر کا یہ حال ہو، تو اہلِ علم سے زندگی کے مسائل کو سلجھانے کی کیا توقع کی جاسکتی ہے، تقلید و جمود اور باہمی اختلاف ونزاع نے علماء وفقہا کی ساری توانائیوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اب مسائل کا حل قرآن وسنت، عقل و دانش اور مفادِ عامہ کی روشنی میں نہیں سوچا جاتا تھا، بلکہ اپنے اپنے مسلک کے مدون فقہی اقوال میں تلاش کیا جاتا تھا، اب شریعتِ مقدسہ اور فقہ دو مترادف لفظ بن گئے تھے، اب قانون کا بنیادی ماخذ قرآن وسنت نہیں تھا، اسے (قرآن وسنت) اب ثانوی درجہ حاصل تھا۔ ابوالحسن کرخی نے کہا تھا: ''جو آیت یا حدیث ہمارے امام کے قول کے مطابق نہیں، وہ منسوخ ہے یا ماٴوّل۔''[۱۲]

بے شبہ علمائے دربار اور فقہائے جامد کے علمی اور اخلاقی انحطاط کے خلاف علامہ ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم اور اس پایہ کے دوسرے علمائے حق نے آواز اُٹھائی، اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ چاروں مذاہب کے نام سے جو ''فقہی جبر'' روا رکھا گیا تھا، اس کے خلاف ابنِ تیمیہ نے بغاوت کی، ابنِ قیم نے الطرق الحکمیۃ میں بڑے درد وکرب سے لکھا: ''علماء کے ایک گروہ نے شریعت کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں وہ مخلوق کے مفادِ عامہ کی حفاظت نہیں کرسکتی، ان لوگوں نے ادراکِ حقیقت کی صحیح راہوں کو خود ہی اپنے پر بند کر رکھا ہے اور یہ سمجھ کر رکھا ہے کہ یہ راہیں شرعی قواعد سے متصادم ہیں۔ بخدا! ایسا نہیں ہے،--- حکام نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اُنھوں نے یہ خیال کیا کہ لوگوں کے معاملات کی اصلاح شریعت سے، جیسا کہ ان علماء (جامد) نے اسے سمجھ رکھا ہے، نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حکام نے سیاست میں شر و فساد کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔''[۱۳] حقیقت یہ ہے کہ ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم کی زوردار تحریریں اور دردناک صدائیں فضا میں تحلیل ہوکر رہ گئیں اور مسلم دُنیا برابر تقلید و جمود کی تاریکیوں میں بھڑکتی رہی۔ اس صورتِ حال کے خلاف عہدِ حاضر میں پہلے عرب دُنیا میں جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور شیخ رشید رضا نے کامیاب آواز اُٹھائی، پھر برصغیر میں مولانا شبلی، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ صرف علماء کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کو بھی گم کردہ راہ قرار دیا۔ فکر ونظر سے علماء اور 'دانش وروں' کی ناآشنائی کا ذکر کرتے ہوئے ابوالکلام نے اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاص انداز میں کہا تھا: ''یہاں صرف دو گروہ ہیں: علماء اور جدید تعلیم یافتہ گروہ، مگر دونوں مذہب سے ناآشنا اور منزل سے بے خبر۔ ایک کو کشتی نہیں ملتی، دوسرے کو ساحل نہیں ملتا۔'' اقبال اور ابوالکلام کی انقلابی صداؤں نے ہمارے فکری جمود و تعطل کو کہاں تک توڑا؟ اس کا جواب تو اہلِ نظر ہی دے سکیں گے، البتہ ہم اس تلخ حقیقت کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ پوری مسلم دُنیا ابھی تک اپنی سرزمین پر صحت مند رُوحانی، اخلاقی سیاسی قدروں پر مبنی ایسا جمہوری نظام قائم کر نہیں پائی جو ہمارے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنے کا عزم رکھتا ہو۔ چنانچہ آج مسلم معاشرہ فکری اور اخلاقی بحران کا شکار ہے، ایک طرف فکری ژولیدگی ہے، جو ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی اور جس نے ہماری منزل کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، دوسری طرف نفاق ہے جو ہماری عملی زندگی کی علامت بن کر رہ گیا ہے۔ اس فکری ژولیدگی اور عملی نفاق کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنی فکری اور ذہنی صلاحیتوں سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اجتہاد، تحقیق اور آزادیٔ فکر سے وابستہ روایات سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے اور رُوحِ عصر کا ساتھ دینے سے برابر گریز کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم اپنے اجتماعی مسائل کو خوش اسلوبی سے حل نہیں کر پاتے، مثلاً ایک ہی مجلس میں دی گئی تین طلاق کا مسئلہ پوری مسلم سوسائٹی کے لیے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ''حلالہ'' جیسے مکروہ حیلہ سے مسلم خواتین کا وقار ختم ہو گیا ہے۔ حالانکہ ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم اور فقہ جعفری ایک ہی وقت میں دی گئی ''تین طلاق'' کو نہیں مانتے۔ جامعہ ازہر کے ایک سابق شیخ الازھر (شیخ محمود شلتوت) نے کہا تھا کہ ہم نے ایک ہی وقت میں دی گئی تین طلاق کے مسئلہ میں فقہ جعفریہ کے مسلک کو تسلیم کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایک ہی نشست میں تین طلاق دینے کا غیر شرعی طریقہ زور پکڑنے لگا تو حضرت عمرؓ نے سزا کے طور پر اسے نافذ کر دیا، تاکہ لوگ اس رسم سے دور رہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کی تمنا پوری نہ ہوئی۔ انہیں اس بات کا دُکھ تھا کہ اُنہوں نے طلاقِ ثلاثہ کو سزا کے طور پر کیوں نافذ کیا تھا۔ [۱۴]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مرحوم مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''حقوق الزوجین'' اور ''تنقیحات'' میں ایک ہی نشست میں طلاقِ ثلاثہ کے مسئلہ پر سخت تنقید کی ہے ۱۶ز بجا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر لکھا ہے: ''ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا، تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بناؤ۔ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر کس نے فرض کیا تھا کہ ان دونوں (قرآن و سنت) سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو (قیامت کے روز) اس باز پرس کے جواب میں اُمید نہیں کہ کسی عالمِ دین کو کنز الدقائق، ہدایہ اور عالم گیری کے مصنّفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔''

جب ۱۹۶۲ء میں مرحوم صدر محمد ایوب خان نے اس شرم ناک مکروہ رسم (ایک ہی نشست میں تین طلاق اور حلالہ) پر پابندی لگائی اور اسے ایک ہی طلاق قرار دیا تو مولانا موصوف نے لکھا کہ مسلمانوں کی جو جماعت (حنفی حضرات) اسے جائز قرار دیتی ہے، ان پر پابندی نہ لگائی جائے۔ مولانا چوں کہ سیاسی میدان میں بھی تھے اور ملک میں حنفی حضرات کی اکثریت ہے، اس لیے انہیں اپنے ہی قیمتی فتویٰ میں ترمیم کرنا پڑی۔ (ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۴۲)

یاد رہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہی نشست میں طلاقِ ثلاثہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ ایسے ہی اگر دادا کی موجودگی میں اس کا بیٹا فوت ہو جائے تو دادا کی وفات پر پوتے کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا لیکن مولانا آزاد نے پوتے کی وراثت، زندگی کے بیمہ اور عورت کی سربراہی کے حق میں فتویٰ دیا۔[۱۵] ایسے ہی جب تقسیمِ ہند کے بعد کلکتہ کی ایک عدالت نے فسخِ نکاح سے متعلق ایک مسلم خاتون کے حق میں فیصلہ دیا، جس کا خاوند اسے چھوڑ کر مشرقی بنگال چلا گیا تھا اور اپنی بیوی کو خرچ نہیں بھیجتا تھا اور نہ ہی اسے اپنے پاس بلاتا تھا۔ جب عدالت کا فیصلہ آیا تو علما نے کہا کہ غیر مسلم عدالت کا فیصلہ شرعی طور پر قابلِ قبول نہیں۔ لیکن مولانا آزاد نے عدالت کے اس فیصلے کو شرعی طور پر جائز قرار دیا۔[۱۶]

اس صورتِ حال کا ہمیں سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے، اور اپنے اجتماعی مسائل کو ان کے صحیح تناظر ہی میں حل کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں امام مالک کے ایک فقہی اُصول کو بیان کرتے ہوئے مرحوم رشید رضا لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''(ہمارے مسائل میں) جہاں تک عبادات کا تعلق ہے، ان میں قرآن و سنت کے ظواہر نصوص پر عمل کرنا چاہیے، اور جہاں تک دُنیاوی معاملات اور سیاست کا تعلق ہے، تو اُن کی بنیاد ظواہرِ نصوص کے بجائے بھلائی کے حصول اور برائی کے خاتمہ پر ہے (**جلب المصالح و درء المفاسد**) اگر دونوں میں، یعنی ظواہر نصوص میں اور پبلک مفاد (مصلحہ) کے حصول میں تعارض واقع ہو جائے تو پھر پبلک مفاد (**المصلحه**) کی خاطر نصوص کی تاویل کی جائے گی۔''[۱۷] اسی قسم کی رائے کا اظہار امام شاطبی نے الموافقات میں کیا ہے، کہ ''دین کی بنیاد وحی پر ہے اور سیاست اور (دُنیاوی امور) کی بنیاد عقل، مشاہدے اور تجربے پر ہے۔'' ہمارے اسلاف نے دینی و دُنیاوی مسائل کو سلجھانے کے لیے جس دقتِ نظر، بصیرت اور عزم سے فیصلے کیے تھے، وہ آج ہماری تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں، چنانچہ ہمیں اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فکری جدوجہد سے کام لینا ہوگا تاکہ اپنے مسائل کو ان کے صحیح تناظر ہی میں حل کرسکیں۔ ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ اہلِ علم نے کبھی بھی کسی مجتہد کے اجتہاد کو حرفِ آخر تصور نہیں کیا، حتیٰ کہ ہمارے عہد میں بھی قدامت پسند سنجیدہ حلقے بھی اجتہاد کے قائل ہیں، ہدایۃ یا فتاویٰ عالمگیری کے فقہی فیصلوں کے بارے میں ایک بار مرحوم مفتی محمد شفیع (دیوبندی) صاحب نے لکھا تھا: ''ان تالیفات اور مجموعوں میں جو فیصلے درج ہیں، ان میں سے بعض کو نظرانداز یا منسوخ کیا جاسکتا ہے یا دوسرے فیصلوں کو ان کی جگہ دی جاسکتی ہے۔''[۱۸]

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ عہدِ حاضر میں مجتہد کے لیے جہاں عربی زبان و ادب، قرآن و سنت کے نصوص اور فقہی سرمایہ سے آگاہی ضروری ہے، وہاں عہدِ حاضر کے جدید سیاسی اور اقتصادی افکار سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ جس طرح عربی زبان اور قرآن و سنت کا علم رکھے بغیر اجتہاد کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے، اسی طرح جدید فلسفۂ سیاست و معیشت سے آگاہی کے بغیر تفقہ و اجتہاد کا دعویٰ محلِ نظر ہے اور خودفریبی کے مترادف۔ چنانچہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کا ناقدانہ جائزہ لیں، کہ وہ کس حد تک ہماری اخلاقی، علمی روایات اور روحِ عصر کا ترجمان ہے۔ فکری جدوجہد یا اجتہاد ہی ایک ایسی راہ ہے جس پر چل کر ہم اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکری بحران پر قابو پا سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے کہا ہے: ''وَالَّذِیْنَ جَاهِدُوا فینا لنهدینّهم سبلنا.'' (عنکبوت:۶۹) یعنی ''جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد سے کام لیتے ہیں، ہم ان کے سامنے یقیناً حق وصداقت کی نئی نئی راہیں کھول دیتے ہیں۔''

حواشی وحوالہ جات:

[۱] ظہر الاسلام، قاہرہ، ۱۹۵۲ء، ج ۲، ص ۲۶۴۔

[۲] محمد باشا المخزومی: خاطرات جمال الدین الافغانی، دمشق، ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۱۔

[۳] اجتہاد کا لفظ محنت ومشقت برداشت کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے، کہا جاتا ہے، اجتهد ای بذل ما فی وسعه، یعنی اُس نے جس قدر ممکن تھا، محنت سے کام لیا۔ چنانچہ جو کام محنت ومشقت سے خالی ہو، وہاں اجتهد بولا نہیں جاتا۔ مثلاً یہ نہیں کہا جاتا، ''اجتهد فی حمل الخرولة'' اُس نے پودے کی پتیوں کو اُٹھانے میں مشقت سے کام لیا۔ اہلِ اصول کے ہاں اجتہاد سے مراد ہے، کسی شرعی حکم کے استنباط میں فقیہ کا اس حد تک محنت سے کام لینا کہ اس سلسلہ میں مزید محنت اس کے بس سے باہر ہو۔ یہاں پر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اجتہاد وہیں ہوتا ہے جہاں پر کسی شرعی حکم میں کوئی قطعی دلیل نہ ہو، مثلاً وجوبِ صلوٰۃ وزکوٰۃ کے بارے میں کوئی اجتہاد نہیں، کیونکہ دونوں کا ثبوت قطعی دلیل (قرآن مجید) سے ہو چکا ہے۔

علماء نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ آیا کوئی عہد مجتہد سے خالی رہ سکتا ہے؟ امام ابوحنیفہ، مالک، اور شافعی نے کہا ہے کہ ایسا ممکن ہے، لیکن حنابلہ نے کہا کہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ کوئی عہد مجتہد سے خالی ہو۔ علمائے اصول نے اجتہاد کے بارے میں جو تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے لیے دیکھیے، مقالہ ''اجتہاد'' در ''موسوعة الفقه الاسلامی'' قاہرہ، ج ۳، ص ۵-۱۱ (ط۔ المجلس الاعلیٰ للشؤن الاسلامیة)۔

[۴] ملاحظہ ہو، ابنِ قیم: اعلام الموقعین، قاہرہ، ج ۱، باب ''اجتهاد الرأی فیما لم یوجد فیه نص''، (تصحیح منیر دمشقی)

[۵] ابنِ قیم نے اعلام الموقعین اور ''الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة'' میں خوب صورت بحث کی ہے۔ ''فاذا ظهر أماوات العدل وأسفر وجهه بأیّ طریق کان' فثم شرع الله ودینه.'' دیکھیے: الطرق الحکمیة، قاہرہ، ۱۳۱۷ھ، ص ۱۴ (ط۔ المؤید والآداب)

[۶] المدخل الی علم أُصول الفقه، دمشق، ۱۹۵۵ء، (دوسرا ایڈیشن)، ص ۲۹۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

[۷] ایضاً، ص ۲۹۶-۲۹۹، نیز دیکھئے: شیخ محمد الخضری: تاریخ التشریع الاسلامی، ط۔السعادۃ، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ص ۱۲۲-۱۲۴۔

[8] The Teaching of the Quran that life is a process of progressive creation necessitates that each generation, guided but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted to solve its own problems. (The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, ed. M. Saeed Sheikh, Lahore, p. 134)

[9] I am quite sensible of the difficulties that lie in our way, all that I can say is that if we cannot get over our difficulties, the world will soon get rid of us. (Speeches, Writings and Statements of Iqbal, Ed. Latif A. Sherwani, Iqbal Academy, Lahore, 1977, p. 97)

[۱۰] ملاحظہ ہو: المدخل الی اصول الفقه، ص ۴۷۔

[۱۱] (لو استقبلتُ ما استدبرتُ مِن أمری لأخذتُ فضول أموالِ الاَغنیاءِ وَقسّمتها علی الفُقراء)۔ طہ حسین، الفتنۃ الکبری، ج ا، ص ۱۷، دار المعارف، قاہرہ۔

[۱۲] شیخ محمد الخضری: تاریخ التشریع الاسلامی، ۱۹۵۴ قاہرہ، ص ۳۲۴: ''کل آیۃٍ تخالف ما علیه اصحابُنا فهی مؤولة او منسوخة و کل حدیثٍ کذٰلک فهو مؤول اَو منسوخ''۔

[۱۳] الطرق الحکمیة: ص ۱۳ (وسدّوا علی نفوسهم طرقا صحیحة من طرق معرفة الحق والتنفید له والطرق عطلوا ها مع علمهم وعلم غیرهم قطعاً... ظنّا منهم منافاتها لقواعِد الشرع، ص ۱۳)

[۱۴] إنه ندم علی ذلک قبل موته، الطرق الحکمیة، ص ۱۷۔ نیز دیکھئے: الامام عبدالحسین شرف الدین الموسوی: ألنص والاجتهاد، بیروت، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۸-۲۱۳۔ یہاں اس مسئلے پر جدید و قدیم علماء اور معروف دانشوروں نے تین طلاق کے مسئلہ پر عمدہ بحث کی ہے، جو پڑھنے اور عمل کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔

[۱۵] فکر ونظر، اسلام آباد، اگست ۱۹۶۵ء، ص ۱۶۸-۱۷۳۔

[۱۶] ملفوظاتِ آزاد، ج ا، ص ۱۲۱، (مرتب محمد اجمل، دہلی)

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آج کل خواتین بھی زندگی کے تمام شعبوں، تجارت، سیاست و تعلیم و تدریس میں کام کر رہی ہیں۔ سورۃ النساء: ۳۴ میں مردوں کو عورتوں کا سرپرست قرار دیا گیا ہے۔ (قوّامین) اس لیے کہ وہ گھر کا پورا خرچ برداشت کرتے ہیں، لیکن اب خواتین بھی اجتماعی طور پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مردوں کے ساتھ سرکاری اور نجی ملازمتوں پر فائز ہیں، اس لیے اب مرد اور عورتیں دونوں 'قوام' بن گئے ہیں اور مل کر گھریلو اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ میدانِ سیاست میں خواتین نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سیاسی نقطۂ نظر سے مردوں کے برابر ہیں۔ جدید تاریخ میں بھارت میں مسز اندرا گاندھی، برطانیہ میں مسز تھیچر اور لنکا میں مسز بندرا نائیکے نے وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو کر اپنی فکری اور سیاسی برتری کو دُنیا سے منوا لیا ہے۔ پاکستان میں مرحومہ مسز رعنا لیاقت علی، مسز ملیحہ لودھی، مسز عابدہ حسین، امریکہ اور برطانیہ میں پاکستان کی سفیر رہ چکی ہیں۔ مسز شمشاد اختر سٹیٹ بنک کی گورنر، مسز جسٹس ماجدہ رضوی ہائی کورٹ کی جج رہ چکی ہیں۔ آج یہ دانش مند خواتین ''قوامون'' کی صف میں کھڑی ہیں۔ اس لیے میراث اور گواہی میں بھی خواتین کو برابر کا شریک ہونا چاہیے۔

[۱۷] المنارج ۲، مجلد ۳۵، ص ۱۳۰ (وأظهر قواعد ائمه الفقه فيها قاعده الامام مالك بن اُنس رحمه اللّٰه تعالى الماخوذة من سياسة السنّة وسيرة الخلفاء الراشدين وهى أنّ احكام العبادات تبنى على العمل بظواهر نصوص الكتاب، والسنة. واحكام السياسة والمعاملات الدنيوية تبنى على جلبِ المصالح ودرء المفاسد دون ظواهر النصوص، فان تعارضا يوؤل النص لمراعاة المصلحة)

[۱۸] کمال فارقی: اجماع اور باب اجتہاد، کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۶ (مطبوعات ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، ترجمہ مظہر الدین صدیقی)۔

© rasailojaraid.com